AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

پاکستانی اردو انشائیہ میں فرد اور سماج کا تعلق: ایک سماجیاتی تجزیہ

عارف اللہ خان
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور
ڈاکٹر اعجاز احمد جان
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

Abstract
This article presents a sociological analysis of the individual-society relationship in the Pakistani Urdu short essay (Inshaiya). Analyzing iconic motifs like Pagdandi, pul, and Bargad, the study shows how everyday observations become metaphors for social balance. It argues that the individual is neither detached from society nor a mechanical cog, positioning Inshaiya as an alternative narrative of contemporary Pakistani culture.
Keywords
Pakistani Urdu Inshaiya, Individual and Society Relationship, Cultural Identity, Wazir Agha ,Urdu Prose Aesthetics

انسانی تہذیب کی پوری تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ فرد اور سماج ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تشکیل و تکمیل کا وسیلہ ہیں۔
انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، تو وہ ایک ایسے منظم معاشرے میں قدم رکھتا ہے جہاں بولنے کے لیے لسانی ڈھانچہ پہلے سے موجود ہوتا ہے، رسم و رواج اس کی پیدا ہونے سے پہلے ہی نمو پا چکے ہوتے ہیں، اور معاشرے کی اخلاقی و ثقافتی پیمانے اس کے مستقبل کے طور طریقوں کو راستہ دکھاتی ہیں۔ معاشرہ محض افراد کا کوئی ظاہری ہجوم یا عددی مجموعے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی باطنی حقیقت ہے جو بے شمار لوگوں کے کاموں، تجربوں، جذبوں اور باہمی تعلقات سے مل کر بنتی ہے۔ اسی لیے فرد سماج کو تشکیل دیتا ہے اور سماج فرد کی زندگی کو مقصد اور معنی عطا کرتا ہے۔ پاکستانی اردو انشائیہ اپنی سوچ، موضوعات اور ساخت کے لحاظ سے اسی آفاقی سچائی کا عکاس ہے۔ یہ محض دل کو بہلانے والی ادبی صنفِ نثر نہیں ہے، بلکہ یہ اپنے عہد کی اجتماعی شعور، ثقافتی تبدیلیوں اور فرد و سماج کے مابین پیدا ہونے والے کھینچاؤ کا ایک گہرا سماجی مطالعہ ہے۔ انشائیہ کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ کسی خشک فلسفیانہ بیانیے یا بھاری بھرکم فارمولوں کے بجائے، ہماری روزمرہ زندگی کے بالکل سادہ، بظاہر غیر اہم اور نظر انداز کر دیے جانے والے مشاہدات کو اشاروں کنایوں میں یوں بیان کرتی ہے کہ انسان کی داخلی دنیا اور سماج کا خارجی ڈھانچہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو انشائیہ نگار سماج کی اجتماعی ضمیر کی عکاسی اس طرح کرتا ہے کہ روزمرہ آشیاء، قدرتی مناظر اور عام انسانی افعال محض اپنے مروجہ معنوں تک محدود نہیں رہتے، بلکہ وہ تہذیبی تسلسل، سماجی جڑاؤ اور اخلاقی توازن کی مثالیں بن جاتے ہیں۔

پاکستانی سماج کے مخصوص حالات میں، جہاں روایات اور جدیدیت کے بیچ ایک مستقل کشمکش جاری ہے، اردو انشائیہ فرد کو ایک ایسے وجود کے طور پر پیش کرتا ہے جو اپنی انفرادیت اور داخلی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں بھی وسیع سماجی نظام سے کٹا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کا ملاپ ذاتی مشاہدے کو ایک ایسی سماجی گفتگو بنا دیتا ہے جہاں سے ہم اپنے سماج کے داخلی ڈھانچے اور انسانی رویوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

انسان کی آزادی اور سماجی جبریت کے درمیان پایا جانے والا توازن کسی بھی مہذب، باشعور اور ترقی یافتہ سماج کی بقا اور صحت کا ضامن ہوتا ہے، کیونکہ جب یہ توازن بگڑ جاتا ہے تو فرد یا تو شدید انانیت کا شکار ہو کر سماجی ذمہ داریوں سے فرار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یا پھر وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں، فطری رجحانات اور ذاتی شعور سے محروم ہو کر سماجی مشینری کا ایک بے جان پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک فکر انگیز اور علامتی اسلوب کے حامل انشائیے میں اسی فکری و سماجیاتی گتھی کو سلجھانے کے لیے "پگڈنڈی" اور "سڑک" کا ایک بلیغ علامتی تقابل پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق "سڑک" اس طے شدہ یکسانیت، جبری نظام اور اندھی تقلید کی علامت ہے جو جدید صنعتی، بیوروکریٹک اور سرمایہ دارانہ سماج میں فرد پر مسلط ہو کر اس کی انفرادی کاوشوں اور ذاتی تجربے کی گنجائش کو سلب کر دیتا ہے، جبکہ اس کے برعکس "پگڈنڈی" انسانی فطرت کی اس آزاد تحریک، تخلیقی انفرادیت اور باطنی حریت کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی پہلے سے طے شدہ نقشے کی پابند ہونے کے بجائے فرد کو

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اپنی راہ خود تلاش کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ تصور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر سماج فرد کی انفرادی صلاحیتوں کو کچل کر اسے صرف ایک مخصوص مشینی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، تو اجتماعی شعور جمود، انتشار، بے معنویت اور روحانی زوال کا شکار ہو جاتا ہے، اور پگڈنڈی جیسا رویہ فرد کو سماج کے ساتھ ایک متحرک، تخلیقی اور بامعنی تعلق میں باندھے رکھتا ہے جہاں انفرادیت اجتماعیت کی ضد نہیں، بلکہ اس کی تقویت کا ذریعہ بن کر ابھرتی ہے، اور یہی وہ فکری نکتہ ہے جسے ڈاکٹر وزیر آغا اپنے اس استعارتی نظام کے ذریعے یوں اجاگر کرتے ہیں:

"سیدھی سڑک پر تو صرف قیدی چلتے ہیں، بابو لوگ چلتے ہیں، تہذیب اور قانون کے کارندے چلتے ہیں، انسان کو تو سیدھی سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی اختیار کرنی چاہیے۔ پگڈنڈی اختیار کرنے میں بڑا لطف ہے۔ آپ کے سامنے زمین کا ایک وسیع و عریض حصہ ہے جس میں آپ اپنے قدموں سے ایک نئی راہ تراشتے ہیں۔ سڑک کو تو ایک دوسرے کے تعاقب میں بڑھتے ہوئے قدموں نے روند روند کر سیدھا کر دیا ہے۔"(۱)

فرد کی اس تخلیقی انفرادیت اور آزاد راستے کی جستجو کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ معاشرتی جڑت اور سماجی ہم آہنگی سے مکمل طور پر منحرف ہو جائے، بلکہ اس کے فروغ کے لیے ہمیشہ ایسے مراکزِ ثقل کی ضرورت ہوتی ہے جہاں افراد اپنی ثقافتی، معاشی اور طبقاتی تفریقات کو پس پشت ڈال کر ایک مشترکہ انسانی تجربے میں شریک ہو سکیں۔ دیہی ساجیات کے تناظر میں "برگد" کا درخت اسی نوعیت کے ایک روایتی اور غیر رسمی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے جہاں فرد کی انفرادیت، اجتماعیت کی صورت میں تبدیل ہوتی ہے۔ شفیع ہمدم کے نزدیک "برگد" صرف تپتی دوپہر کا سایہ یا ایک نباتاتی وجود نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا سماجی عالمِ صغیر ہے جو اجتماعی تحفظ، استقامت اور سخاوت کے مظاہر کی عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ برگد کا پھیلاؤ اور اس کی گہری دھنسی ہوئی جڑیں سماج کے ان باہمی تعلقات کا مظہر ہیں، جو نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں اور سماج کو ایک مضبوط تمدنی اکائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہاں فرد گھر کی محدود فضا سے نکل کر ایک ایسی عوامی جگہ کا حصہ بنتا ہے جہاں بات چیت، کھیل اور مشترکہ مشاہدات کے ذریعے سماجی ہم آہنگی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ غیر رسمی نوعیت کے مقامات ہوتے ہیں جہاں کسی بھی روایتی تہذیب کی حقیقی روح اور اس کی فکری توانائی محفوظ رہتی ہے، جو جدیدیت کے سیلاب کے سامنے مزاحمتی قوت بن جاتی ہے، شفیع ہمدم نے اپنے انشائیہ "برگد" میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"مجھے لگا کہ دیہات میں برگد کی حیثیت ایک کلب کی سی ہے۔ لوگ گھروں کی محدود فضا سے نکل کر اس کلب میں آ جاتے ہیں۔ تاش کھیلتے، گپیں لگاتے، ریڈیو سنتے، آرام کرتے اور ماہیے ٹپے گاتے ہیں۔ گاؤں کے کلچر اور گاؤں والوں کی نفسیات کا پتہ اس کلب سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ برگد بجا طور پر گاؤں کا ایک ثقافتی مرکز ہے۔"(۲)

روزمرہ زندگی میں عوامی مقامات پر قائم ہونے والے یہ غیر رسمی تعلقات دراصل انسانی معاشرت کے اس ارتقائی سفر کا اہم حصہ ہیں جہاں فرد کی داخلی خواہشات، احساسات اور خارجی سماجی ڈھانچے کے درمیان ایک غیر منقطع مکالمہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ انسانی رویہ محض وقتی محرکات اور فطری جبلتوں کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان معروضی تعلقات، مشاہدات اور تجربات کا حاصل ہوتا ہے جو فرد کو اپنے اردگرد کے ماحول سے ملتا ہے، اسی لیے انسانی وجود کو ایک جامد حقیقت کے بجائے ایک متحرک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو ہر لمحہ نئے معانی، نئی جہتیں اور نئے روابط پیدا کرتا ہے۔ اردو انشائیہ میں یہ فکری پہلو صرف سائنسی یا خشک تجزیاتی انداز میں نہیں ابھرتی، بلکہ علامتی اور استعاراتی سطح پر زیادہ گہرائی اور تاثیر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے، جہاں انسانی فطرت کو ایک بنیادی تعلق بنانے والی قوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ فرد اپنے احساسات، مشاہدات اور جذبات کے ذریعے مسلسل اپنے گرد موجود دنیا سے جڑت قائم رکھتا ہے اور یہی جڑت اس کی سماجی شناختی تعمیر کا بنیادی وسیلہ بنتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیہ "پُل" میں یہی تصور اپنے انتہائی بلیغ اظہار تک پہنچتی ہے، جہاں جوڑنے کے عمل کو انسانی زندگی اور سماجی استحکام کی بنیادی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کا اظہار یوں ہوتا ہے:

"اس کے دل میں کہیں بہت اندر، جُڑنے بلکہ جوڑنے کی ازلی و ابدی خواہش موجود ہے۔ وہ اپنی پانچوں حسیات کو طلائی زنجیروں کی طرح استعمال کرتے ہوئے اردگرد کی اشیا، افراد اور مظاہر کو تمام عمر جوڑتا رہتا ہے یہی جوڑنا پل بنانا کہلاتا ہے۔"(3)

جوڑنے کی یہ خواہش اور روابط کا تانا بانا اسی وقت تک پائیدار رہ سکتا ہے جب تک سماجی زندگی میں فرد کی خود مختاری اور اجتماعی نظم کے درمیان موجود توازن برقرار رہے۔ اگر فرد کو بے حد اور لامحدود آزادی دے دی جائے تو سماج انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، اور اگر اسے مکمل طور پر سماجی قوانین کے جبر کے ماتحت کر دیا جائے تو اس کی تخلیقی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے، اس لیے تہذیب ہمیشہ ایک ایسے متبادل اور معتدل راستے کی جستجو کرتی ہے جہاں فرد کی اپنی انفرادیت بھی برقرار رہ سکے اور اجتماعی نظام کا حصہ بھی بنا رہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا انشائیہ "پتنگیں" اسی پیچیدہ سماجی اصول کو ایک خوبصورت استعارے کے صورت میں پیش کرتا ہے، جہاں پتنگ کی اڑان اس وقت تک ممکن ہے جب تک وہ انسان کے ہاتھ میں موجود ڈور کے ضابطے اور بندش سے جڑی ہوئی ہے۔ ڈور سے کٹتے ہی پتنگ کی اڑان اور ہستی دونوں ختم ہو

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جاتے ہیں، چنانچہ حرکت اور بندش کا یہی امتیاز سماجی توازن کی حقیقی بنیاد کو ظاہر کرتا ہے، اور یہی اڑان کائنات میں سکون اور ٹھہراؤ کو توڑنے کا باعث بنتی ہے، ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"جو نہی پتنگیں آسمان میں اُبھرتی ہیں، جاڑے کو اپنا رختِ سفر باندھنے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ صحنِ چمن میں بہار اُتار دی جاتی ہے، خزاں کا مرجھایا ہوا چہرہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ درخت برگ و بار لانے لگتے ہیں۔ رنگ برنگے پھول کھِل اٹھتے ہیں، احساس ہونے لگتا ہے کہ کائنات اپنا پرانا چولا بدلنے لگا ہے۔"(4)

سماجی نظام کے اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے معاشی اور اخلاقی شعبوں کا باہم مربوط ہونا ناگزیر ہے، کیونکہ معاشی نظام میں انسانی مشقت صرف ایک انفرادی یا مادی عمل نہیں ہے، بلکہ یہ ایک وسیع اجتماعی تعلق کی شکل اختیار کرتی ہے جس میں افراد ایک دوسرے کی صلاحیتوں، ضروریات اور خدمات کے ذریعے ایک مربوط سماجی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں۔ جب محنت کو صرف شخصی فائدے، استحصالی رویوں یا مادی قیمت کے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے تو سماج میں بیگانگی، طبقاتی تقسیم اور عدم توازن پیدا ہوتا ہے، لیکن جب یہی مشقت اجتماعی فلاح اور باہمی تعاون کے تصور سے وابستہ جاتی ہے تو ایک متوازن اور ہم آہنگ سماجی ماحول جنم لیتا ہے۔ پاکستانی اردو انشائیہ اس معاشی و اخلاقی حقیقت کو صرف فکری سطح پر نہیں رکھتا بلکہ اسے انسانی مشاہدے کی صورت میں پیش کرتا ہے جہاں محنت و مشقت ایک سماجی اور اخلاقی تعلق کی علامت بن جاتی ہے۔ مشکور حسین یاد کی انشائیہ "کسبِ زر" اس معاشی حقیقت کا عمیق جائزہ لیتے ہوئے بتاتا ہے کہ انسان اپنی محنت کے ذریعے نہ محض اپنی زندگی کو کامیاب بناتا ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے استحکام اور مضبوطی میں بھی بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اور محنت کو مادی داموں تولنا ایک سنگین معاشرتی غلطی ہے۔ مشکور حسین یاد اپنے انشائیے "کسبِ زر" میں لکھتے ہیں:

"انسانی محنت کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی اور ہم انسانی محنت کی قیمت لگاتے ہیں۔ ہماری اسی غلطی سے معاشرے کی بیشتر برائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ مزدور کی مزدوری چکا کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہم پر اس کا کوئی احسان نہیں رہا بلکہ ہم نے اس پر احسان کر دیا ہے۔"(5)

معاشی اور اخلاقی شعور کی بنیادیں درحقیقت خاندان کے اندر ہی استوار ہوتی ہیں، کیونکہ خاندان انسانی سماج کی وہ بنیادی اور مؤثر اکائی ہے جہاں فرد ابتدائی سماجی اقدار، باہمی روابط اور اخلاقی اصولوں کا شعور حاصل کرتا ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو انسان کو محض ایک فطری اور حیاتیاتی وجود سے باہر نکال کر ایک ذمہ دار اور باشعور سماجی فرد میں تبدیل کرتا ہے، اور اس کے اندر احساسِ ذمہ داری، محبت، تعاون اور قربانی جیسے اقدار پروان چڑھتی ہیں۔ فرد کی شخصیت کی ابتدائی تعمیر بھی اسی تربیتی ماحول میں ہوتی ہے جہاں بچہ دوسروں کے ساتھ جینے، اپنے جذبات کا اظہار کرنے اور باہمی روابط قائم کرنے کے طریقے سیکھتا ہے۔ پاکستانی اردو انشائیہ اس عمل کو صرف ایک رسمی سماجی حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ اسے ایک تخلیقی اور جذباتی تجربے کے طور پر بیان کرتا ہے، جہاں بچہ صرف ذاتی تربیت اور نشو نما نہیں پاتا بلکہ آنے والی نسلوں کے سماجی رویوں اور اجتماعی شعور کی تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اسی حوالے سے غلام جیلانی اصغر کا انشائیہ "بچہ پالنا" بچے کی تربیت کو خود غرضی کے خاتمے، سماج میں امن و آشتی اور باہمی ہم آہنگی کو فروغ دینے کا ایک زبردست ذریعہ قرار دیتا ہے، جیسا کہ اس انشائیہ "بچہ پالنا" کی اس اقتباس سے واضح ہے:

"بچہ پالنے سے گریز کرنا دراصل انسانی تہذیب اور امن و آشتی کو تباہ کرنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ جو آدمی خلوص نیت سے بچہ پالتا ہے وہ ایک ایسی معصوم دنیا کا خواب پال رہا ہوتا ہے جس میں خود پرستی اور بے غرض محبت، خود پرستی اور غرض مندی کی جگہ لے لیتی ہے۔"(6)

خاندان کی اس پرخلوص اور فطری تحفظ فراہم کرنے والے فضا کے برعکس جب فرد جدید صنعتی اور مابعد نو آبادیاتی سماج کے وسیع دائرے میں قدم رکھتا ہے، تو اس کی سماجی شناخت کا مسئلہ ایک نہایت حساس، بحرانی پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جدید دور میں عموماً فرد کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے کردار، علم، اخلاق یا باطنی خوبیوں کے بجائے اس کی مقبولیت، عوامی پذیرائی اور ظاہری نمود و نمائش کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے فرد کو ایک ایسے شدید سماجی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے جہاں اس کی ذاتی زندگی، ذاتی تشخص اور داخلی آزادی بتدریج ختم ہونے لگتی ہے اور وہ اجتماعی نگاہوں کا مستقل مرکز بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کی شناخت ایک زندہ اور متحرک حقیقت کے برعکس ایک جامد شے میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے سماج اپنے مخصوص مفادات، ضرورتوں اور تجارتی تصورات کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ مشتاق قمر کا انشائیہ "شہرت کی مخالفت میں" اس سماجی حقیقت کا گہرا تنقیدی اور علامتی جائزہ پیش کرکے واضح کرتا ہے کہ شہرت دراصل فرد کو اس کی اصل ذات، باطنی خودی اور نجی وجود سے دور کرکے ایک نمائشی پیکر میں بدل دیتی ہے، جہاں وہ ایک جیتا جاگتا انسان کم اور ایک مجرد عوامی علامت زیادہ بن جاتا ہے، اس کی عکاسی مشتاق قمر یوں کرتے ہیں:

"تحصیل شہرت کے بعد آپ کی حیثیت پبلک پراپرٹی کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور دوران حیات آپ کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو عام طور پر پبلک پراپرٹی کا مقدر ہوتا ہے۔ بعد از حیات آپ عجائب گھر میں رکھے ہوئے ایسے بے جان بت کا روپ دھار لیتے ہیں جسے عجائب گھر کا گائیڈ ایک ہی دن میں مختلف عنوانات کے تحت متعارف کرا کے خراج تحسین وصول کرتا ہے۔"(7)

اس نمائشی شناخت کے بحران سے نکلنے اور اپنی باطنی ذات کو از سرِ نو پہچاننے کے لیے انسان کو اپنی داخلی توانائی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، کیونکہ انسانی شخصیت کی متوازن نشوونما میں داخلی توانائی اور خارجی سماجی سرگرمیوں کے درمیان ایک مسلسل تعامل کارفرما رہتا ہے، جہاں فرد کی داخلی قوت صرف ایک ذاتی جذبہ یا نجی احساس نہیں رہتی بلکہ ایک مؤثر سماجی امکان بن جاتی ہے۔ انسان کے اندر موجود احساس کی حرارت اور ارادے کی قوت وہ بنیادی عناصر ہیں جو اسے ٹھہراؤ، بے عملی اور جمود کی کیفیت سے نکال کر حرکت اور عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ جب یہ داخلی توانائی سماجی سطح پر اظہار پاتی ہے تو یہ صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے ماحول، روابط اور اردگرد کے دنیا کو متاثر کر کے اجتماعی زندگی میں شعور، بیداری اور مثبت تبدیلی کے امکانات بھی پیدا کرتی ہے۔ اکبر حمیدی کا مشہور انشائیہ "آگ" اس داخلی و خارجی عمل کو محض ایک جذباتی مشاہدے یا نفسیاتی کیفیت کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی طاقت ور علامتی قوت کے طور پر پیش کرتا ہے جو انسانی شخصیت کو مسلسل تشکیل دینے اور اسے نئی معنویت اور تخلیقی توانائی عطا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، جیسا کہ متن میں بیان ہوا ہے:

"دراصل آگ ہی زندگی کی قوت ہے۔ جو کوئی اسے خارجی معاملات و مسائل کی بہتری کے لیے استعمال کرتا ہے اس کے ذریعے اپنے معاشرتی ماحول کو روشن کرتا ہے اور جو اسے اپنے باطن کی روشنی کے لیے استعمال کرتا ہے وہ اپنی شخصیت کو روشن کر لیتا ہے۔"(8)

باطن کی اس بیداری اور داخلی توانائی کے باوجود، فرد اور سماج کے باہمی تعلق میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انسانی رویے ہمیشہ طاقت کے مقابلے میں حکمت، بصیرت، لچک اور حالات کے مطابق خود کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت سے تشکیل پاتے ہیں۔ سماجی زندگی میں ہر فرد کو مختلف قسم کی مزاحمتوں، دباؤ، مشکلات اور غیر موافق حالات کا سامنا ہوتا ہے، تاہم ہر معاشرہ تبھی زیادہ متوازن اور مستحکم ہوتا ہے جب اس کے افراد ہر مسئلے کا حل صرف تصادم میں تلاش نہیں کرتے بلکہ مصلحت آمیز رویوں، بہترین حکمتِ عملیوں اور متبادل راستوں کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انسانی بقا اور کامیابی کا فلسفہ محض طاقت کا استعمال اور اندھی مزاحمت نہیں بلکہ بعض اوقات انحراف، خطرات سے بچاؤ اور طویل مگر محفوظ راستے کا انتخاب سماج اور فرد دونوں کو بڑے انتشار سے بچاتا ہے۔ ناصر عباس نیرّ کا انشائیہ "چیونٹیاں" اس لچکدار اور دانش مندانہ رویے کو محض حیاتیاتی سطح پر نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک گہری سماجی بصیرت اور عملی حکمتِ عملی کے طور پر پیش کرتا ہے جس میں فرد اپنی محدود وسائل اور قوت کے باوجود بھی صبر و برداشت اور بہترین حکمت عملی کی وجہ سے اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے زیادہ عقلمندانہ راستہ اختیار کرتا ہے، ناصر عباس نیرّ کے انشائیے "چیونٹیاں" میں اس کا ذکر یوں ملتا ہے:

"چیونٹی اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کا سامنا خندہ پیشانی سے کرنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتی ہے۔ تاہم رکاوٹ سے بھڑنے کے بجائے اس سے بچ کر چلنے کی قائل ہے، خواہ سفر طویل ہی کیوں نہ ہو جائے اور پاؤں میں کتنے چھالے ہی کیوں نہ پڑ جائیں۔ ظاہر ہے یہ ایک جنگلی حکمتِ عملی ہے اور ایک پورا فلسفہ زندگی بھی!۔"(9)

جہاں چیونٹی کی حکمتِ عملی بیدار زندگی میں تدبر، صبر اور بقا کا راستہ دکھاتی ہے، وہاں انسانی سماج کی اخلاقی اور تہذیبی ساخت میں شعور اور لاشعور کے درمیان جاری کشمکش ایک اور نمایاں کردار ادا کرتی ہے، جہاں فرد کا عملی رویہ عموماً اس کے داخلی خواہشات اور بیرونی اجتماعی حالات کے درمیان پیدا ہونے والے تضادات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بڑے پیمانے پر تباہی، ظلم، تشدد اور اجتماعی بے حسی عموماً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بیداری یعنی شعوری عمل اپنی اخلاقی ضابطوں سے نکل کر خالصتاً اقتدار، خودغرضی، حرص اور مادی مفاد کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فرد کی ایک ایسی ذہنی کیفیت بھی ہوتی ہے جس میں وہ وقتی طور پر اپنے جارحانہ رجحانات، سماجی مقابلہ آرائی اور اقتدار کی خواہش سے آزاد ہو کر ایک پُرسکون اور غیر مضر حالت میں داخل ہو جاتا ہے۔ حامد برگی کے انشائیہ "نیند" میں نیند اور بیداری کو دو متضاد نفسیاتی اور سماجیاتی علامتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں بیداری انسانی خواہشات، جذبات اور طاقت کے استعمال کی نمائندہ بنتی ہے، جبکہ نیند صرف جسمانی آرام کا نام نہیں رہتی بلکہ انسانی فطرت کے اس بے ضرر، معصوم اور غیر تخریبی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے جو تخریب، تشدد، غلبے اور استحصال کی منفی خواہش سے پاک ہوتا ہے۔ حامد برگی اپنے اس انشائیہ میں جدید انسان کے شعوری رویوں، اس کی اخلاقی زوال اور طاقت پرستی پر ایک نہایت گہرا، معنی خیز اور طنزیہ بحث کرتا ہے، جس کی وجہ سے انسانی تہذیب کے کئی پوشیدہ تضادات سامنے آتے ہیں۔ ان کے مطابق:

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"ہمیں تو زندگی کا سارا دکھ عالمِ بیداری کا دکھ دکھائی دیتا ہے، نیند میں انسان کتنا معصوم ہوتا ہے خونخوار سے خونخوار انسان بھی نیند کے عالم میں بے ضرر دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے تمام منصوبے عالمِ بیداری ہی کی حرکتیں ہیں، نیند دھماکوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، ہیروشیما اور ناگاساکی کا منظر اگر نیند میں بھی نظر آ جائے تو انسان ہڑبڑا کر بیدار ہو جائے۔"(10)

مذکورہ تفصیلی تنقیدی مطالعے اور گہرے سماجیاتی تجزیے سے یہ علمی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پاکستانی اردو انشائیہ فرد اور سماج کے باہمی تعلق کو کسی جامد، یک رخی یا میکانکی تناظر میں پیش نہیں کرتا، بلکہ اسے مسلسل ایک زندہ، متحرک، علامتی اور ارتقاپذیر عمل کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ زیرِ مطالعہ انشائیوں کے فکری اور موضوعاتی تجزیے سے یہ معروضی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ فرد نہ تو سماجی بندھنوں سے ماورا مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہستی ہے اور نہ ہی وہ صرف سماجی نظام کا کوئی مجبور اور بے بس پرزہ ہے، بلکہ وہ ان دونوں انتہاؤں کے مابین ایک زندہ، جدلیاتی اور نامیاتی ربط کی صورت میں موجود ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو انشائیہ یہ فکری تصور پیش کرتا ہے کہ سماج در حقیقت انسانی تعلقات، اخلاقی تصورات، ثقافتی روایت اور سماجی اقدار کا ایک ایسا متحرک جال ہے جس کے اندر رہتے ہوئے فرد اپنی شناخت بناتا بھی ہے، اس کو بر قرار بھی رکھتا ہے اور وقت کے ساتھ اسے تغیر پذیری کے عمل سے بھی گزارتا ہے۔ اس حوالے سے، پاکستانی اردو انشائیہ صرف جمالیاتی اظہار کا وسیلہ نہیں، بلکہ یہ سماج کے داخلی محرکات، ثقافتی ساخت، نفسیاتی رویوں اور اجتماعی شعور کو سمجھنے کا ایک انتہائی معتبر، غیر رسمی اور متبادل سماجیاتی ڈسکورس ہے۔

حوالہ جات

1. وزیر آغا، ڈاکٹر، خیال پارے (پگڈنڈی)، لاہور: اکادمی پنجاب، 1961ء، ص 23-24
2. شفیع ہمدم، رعنائی خیال (برگد)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، 2005ء، ص 92
3. وزیر آغا، ڈاکٹر، سمندر اگر میرے اندر گرے (پُل)، لاہور: مکتبہ جدید پریس، مئی 1989ء، ص 65
4. انور سدید، ڈاکٹر، آسمان میں پتنگیں (پتنگیں)، لاہور: مقبول اکیڈمی، 1993ء، ص 9
5. مشکور حسین یاد، جوہر اندیشہ (کسبِ زر)، لاہور: مکتبہ اردو ڈائجسٹ، مئی 1975ء، ص 38
6. غلام جیلانی اصغر، نرم دم گفتگو (بچہ پالنا)، سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، 1996ء، ص 41
7. محمد مشتاق قمر، پروفیسر، ہم ہیں مشتاق (شہرت کے مخالفت میں)، ص 154
8. اکبر حمیدی، پہاڑ مجھے بلاتا ہے (آگ)، اسلام آباد: بٹر پبلیکیشنز، 2003ء، ص 59
9. ناصر عباس نیئر، چراغ آفریدم (چیونٹیاں)، لاہور: کاغذی پیرہن، 2000ء، ص 121
10. حامد برگی، باندازِ دگر (نیند)، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 1993ء، ص 247